Munir Abbas Sipra
Ph.D Scholar, Department of Urdu,
Minhaj University, Lahore

Dr. Munawar Amin
Assistant Professor, Department of Urdu,
Institute of Southern Punjab, Multan

Nazia Ansari
Lecturer, Department of Urdu,
Institute of Southern Punjab, Multan

منیر عباس سیپرہ
پی۔ایچ۔ڈی سکالر، شعبہ اردو، منہاج یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر منور امین
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، انسٹیٹیوٹ آف سدرن پنجاب، ملتان

نازیہ انصاری
لیکچرار، شعبہ اردو، انسٹیٹیوٹ آف سدرن پنجاب، ملتان

''حسن منظر کے افسانے: نفسیاتی عوامل اور داخلی کشمکش''

''Hasan Manzar's Short Stories: Psychological Factors and Internal Conflict''

Abstract: Dr. Hasan Manzar is regarded as a prominent name in Urdu fiction. He was born on March 4, 1934, in Hapur, Uttar Pradesh, and migrated to Pakistan after Partition. He completed his MBBS from King Edward Medical College, Lahore, and later earned a degree in psychiatry from Edinburgh, Scotland. Hasan Manzar's short stories reflect human psychology, social realities, and internal conflicts. His short story collections, ''Rihai, ''Nadidi'', ''Insan Ka Desh'', and ''Sui Bhook'', showcase his intellectual depth. As a psychiatrist, his characters are not merely based on medical observations but are also influenced by social, cultural, and philosophical elements. His writings portray psychological complexities in a natural manner, compelling readers to engage in deep reflection. This unique aspect gives Hasan Manzar's fiction a distinct identity. He does not confine psychological struggles to scientific terminology but presents them through the everyday lives, actions, and dialogues of his characters in a highly organic way.His short stories make us realize that every individual, in one way or another, is burdened by internal conflict and psychological influences.

Keywords: Fiction, Psychologist, Scientific terminology, Sociology, Culture, Class division.

ڈاکٹر حسن منظر اردو فکشن کے اہم ناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو ہاپڑ، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے دوران والدین کے ساتھ لاہور آئے، جہاں سے تعلیمی مراحل طے کیے۔ ایم بی بی ایس کنگ ایڈورڈ کالج لاہور سے کیا اور مزید تعلیم کے لیے ایڈنبرا، اسکاٹ لینڈ گئے، جہاں سے ڈی پی ایم اور رائل کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز سے سائیکیٹری (نفسیات) میں ڈگری حاصل کی۔ کراچی واپسی پر سینٹرل ایکسائز اینڈ لینڈ کسٹم ہسپتال میں کام کیا اور مرچٹلانیوی میں ڈاکٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں مختلف ممالک سعودی عرب اور نائیجیریا وغیرہ میں بھی طب سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۳ء میں پاکستان آکر حیدر آباد میں سائیکاٹرک کلینک قائم کیا اور ۲۰۱۲ء میں کراچی منتقل ہو گئے۔

ڈاکٹر حسن منظر نے اپنا ادبی سفر زمانۂ طالبِ علمی میں شروع کیا اور جلد ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاسوں میں شرکت کے ذریعے ادبی ماحول سے گہرا تعلق استوار کر لیا۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی جیسی قد آور ادبی شخصیات کی پذیرائی حاصل ہوئی، جس نے ان کے ادبی سفر کو مزید جِلا بخشی۔ وہ ابتدا ہی سے سماجی حقیقت نگاری اور نفسیاتی پہلوؤں پر مبنی افسانہ نگاری کی طرف مائل رہے، جس کا اظہار ان کی تخلیقات میں بخوبی نظر آتا ہے۔

حسن منظر کا پہلا افسانوں کا مجموعہ "رہائی" ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا، جس کے اگلے ہی سال "ندیدی" (۱۹۸۲ء) منظرِ عام پر آیا۔ ان کی ادبی شناخت کو مزید مستحکم کرنے میں "انسان کا دیش" (۱۹۹۱ء)، "سوئی بھوک" (۱۹۹۷ء)، "ایک اور آدمی" (۱۹۹۹ء) اور "خاک کا رتبہ" (۱۹۹۷ء) وغیرہ جیسے افسانوں کے مجموعوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کے افسانے معاشرتی حقیقتوں، نفسیاتی گہرائیوں اور انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کی عکاسی کرتے ہیں، جس کی بدولت وہ اردو فکشن میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ حسن منظر نے ناول نگاری میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان کے معروف ناولوں میں "العاصفہ" (۲۰۰۶ء)، "دھنی بخش کے بیٹے" (۲۰۰۸ء)، "وبا" (۲۰۰۹ء)، دو مختصر ناول: "بیر شیبا کی ایک لڑکی۔۔۔ ماں بیٹی" (۲۰۱۰ء)، "انسان اے انسان" (۲۰۱۳ء)، اور "اے فلکِ ناانصاف" (۲۰۱۹ء) وغیرہ شامل ہیں۔ ان ناولوں میں وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں، انسانی نفسیات، سماجی ناہمواریوں اور تاریخی و تہذیبی مسائل کو فکشن کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

افسانوں اور ناولوں کے علاوہ حسن منظر نے تراجم، بچوں کی کہانیاں، خطوط، مضامین اور دیگر نثری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی، جس سے ان کی ہمہ جہتی اور ادبی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا تخلیقی سفر نہ صرف اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے بلکہ سماجی شعور اور نفسیاتی گہرائی کے امتزاج کی عمدہ مثال بھی ہے۔ حسن منظر کو کئی اعزازات ملے، جن میں سعادت حسن منٹو ایوارڈ، مولوی عبدالحق قومی ایوارڈ، عالمی فروغِ اردو ادب ایوارڈ (۲۰۲۰ء)، ستارۂ امتیاز (۲۰۲۲ء) اور کمالِ فن ایوارڈ شامل ہیں۔ ان کی خود نوشت "گزرے دن" ان کی زندگی کے اہم ادوار کی جھلک پیش کرتی ہے حسن منظر کے فن کی بنیاد انفرادی و سماجی نفسیات، سیاسی، تہذیبی، مذہبی اور ثقافتی شعور پر ہے، جس کی بدولت ان کے افسانوں کا لوکیل متنوع اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

ان کی کہانیاں مختلف سماجی طبقات کی عکاسی کرتی ہیں اور ان کے ادبی نظریات اس بنیادی فکر سے جڑے ہیں جو معاشرے میں موجود ظالمانہ عناصر کی تبدیلی پر یقین رکھتی ہے۔ حسن منظر نے شروع ہی سے طبقاتی تفریق، غریبی اور امیری، ظلم اور مظلومیت، عیاشی اور محنت، کھیتوں اور بلند و بالا عمارتوں، خود غرضی اور ایثار، ذات پات کی اونچ نیچ، مذہبی عصبیت، اور سرمایہ داری و جاگیر داری کے پیدا کردہ سماجی تفاوت کو ناپسند کیا۔ یہی حساسیت ان کے افسانوی بیانیے میں نمایاں طور پر جھلکتی ہے، جہاں وہ تضادات کو اجاگر کرتے ہیں اور ایک متوازن اور منصفانہ معاشرے کے قیام کی خواہش رکھتے ہیں۔

حسن منظر کے افسانوں میں نفسیاتی عوامل کا ایک نمایاں پہلو ان کے کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کے ساتھ موجود ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو نفسیاتی پیچیدگیوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی کہانیاں حقیقت کے قریب محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے کردار اکثر سماجی دباؤ اور داخلی خوف کا شکار ہوتے ہیں، جو ان کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ حسن منظر کے افسانے کرداروں کی خودی کی تلاش اور ان کی خود ساختہ حقیقتوں کے ٹکراؤ کو بخوبی اجاگر کرتے ہیں۔ بیشتر کہانیوں میں کردار کسی نہ کسی اندرونی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں، جو کہ حقیقت اور خواب، خواہش اور حقیقت کے درمیان تضاد کو نمایاں کرتا ہے۔ داخلی کشمکش حسن منظر کے کرداروں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کے

افسانے انسانی ذہن میں چلنے والے تضادات کو اجاگر کرتے ہیں، جہاں کردار بیرونی دنیا کے ساتھ جینے کی کوشش میں اپنی اندرونی جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں۔

مصنف خود ایک ماہرِ نفسیات ہیں، اپنے افسانوں میں کرداروں کی نفسیات کو نہایت عمدگی اور باریک بینی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسانی ذہن کے پیچیدہ اور نازک پہلوؤں کو منفرد انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔ ہر افسانے میں وہ نفسیاتی عوامل کو مختلف زاویوں سے پرکھتے ہیں، جس سے ان کی تخلیقات میں تنوع اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ ان کے افسانے '' بوندا باندی، سفید آدمی کی دنیا، میری موت، مخبر، بیچارے، للی، ہمارے دن، ہمارا زمانہ، داشتہ، لاسہ، ایک اور آدمی، نجات،، برسی، اوپر والی'' وغیرہ نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ ان کہانیوں میں انسانی احساسات، داخلی کشمکش، معاشرتی دباؤ، لاشعوری محرکات اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو انتہائی فنی مہارت سے پیش کیا گیا ہے، جو قاری کو فکری و جذباتی تجربے سے گزارتے ہیں۔

ڈاکٹر حسن منظر چونکہ ایک ماہرِ نفسیات ہیں، اس لیے عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ان کے افسانوں میں موجود نفسیاتی پہلو ان کے طبّی مشاہدات اور تجربات کا عکس ہیں۔ تاہم، جب ان کے افسانوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ تاثر بدلنے لگتا ہے۔ ان کے افسانوں میں نفسیاتی عوامل نہ صرف طبّی دنیا سے اخذ کیے گئے ہیں بلکہ یہ زندگی کے مختلف اور متنوع موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے مہرونہ لغاری لکھتی ہیں کہ :

> "عموماً ایک لکھاری اگر ماہر نفسیات بھی ہو تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ کہ ان کا فن ان کے مریضوں کی کیس ہسٹری سے مستعار ہے۔ ان کی تخلیق کے سوتے ان کے پیشے سے پھوٹتے ہیں۔ لیکن یہاں حسن منظر کا اصرار ہے کہ ان کی طرف معاملہ الٹا ہے۔ ان کی سکائیٹری کو ان کے ادب نے فیض پہنچایا ہے۔ دوسرا ماہر نفسیات منظر حسن سے پہلے ادیب حسن منظر نے جنم لیا اور یہ کہ ان کے فن نے ان کی پیشہ ورانوں ذمہ داریوں میں ان کا ہاتھ بٹایا ہے۔ اس لیے ادیب کا پلڑا بھاری ہے۔"(۱)

ڈاکٹر حسن منظر بطور ماہرِ نفسیات، وہ کرداروں کے باطن میں چھپی الجھنوں، خوف، خواہشات اور لاشعوری محرکات کو نہایت سلیقے سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانے محض کہانیاں نہیں بلکہ نفسیاتی مطالعے کی مثالیں بھی ہیں، جہاں کرداروں کے رویے، ان کی ذہنی کشمکش اور داخلی جدوجہد قاری کو غور و فکر پر مجبور کرتی ہے۔ وہ فرد کی نفسیاتی الجھنوں کو کسی خاص طبقے یا پیشے تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ ان کے افسانے سماجی اور ثقافتی اثرات کی روشنی میں انسان کے داخلی تضادات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے کردار اکثر کسی نہ کسی ذہنی الجھن یا جذباتی بحران سے دوچار ہوتے ہیں، جو ان کے افسانوں میں حقیقت پسندی کو نمایاں کرتا ہے۔ ان کے یہ کردار صرف طبّی دائرے تک محدود نہیں بلکہ سماجی، ثقافتی اور فلسفیانہ عوامل سے بھی جڑے ہوتے ہیں۔

حسن منظر کے ہاں نفسیات محض ایک علمی موضوع نہیں بلکہ انسانی تجربے کا بنیادی جزو ہے۔ ان کے افسانے ہمیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ ہر انسان کسی نہ کسی طور پر اپنے ماضی، یادوں، خوف اور ناآسودہ خواہشات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ ان کی کہانیوں میں لاشعور کی وادیوں میں چھپی نفسیاتی گرہیں کھلتی نظر آتی ہیں، جہاں انسان کبھی اپنی ذات سے نبرد آزما ہوتا ہے اور کبھی خارجی دنیا کے جبر کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ وہ نفسیاتی کشمکش کو محض سائنسی اصطلاحات میں محدود نہیں کرتے بلکہ اسے کرداروں کی روزمرہ زندگی، ان کی حرکات و سکنات اور مکالموں کے ذریعے انتہائی فطری انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسن منظر کے افسانے نہ صرف ادبی حسن رکھتے ہیں بلکہ ایک نفسیاتی دستاویز کی حیثیت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

حسن منظر کے پانچویں افسانوں کے مجموعے "ایک اور آدمی"، کا شاہکار افسانہ "ایک اور آدمی" نفسیاتی عوامل کے لحاظ سے ایک منفرد افسانہ ہے۔ حسن منظر نے اس افسانے میں محض سائنسی تجربات کی کہانی شامل نہیں کی بلکہ ایک نفسیاتی المیے کی عکاسی ہے۔ اس کا ایک کردار، وکٹوریا، ایک ایسی گوریلا ہے جس پر افزائشِ نسل کے تجربات کیے جا رہے ہیں، مگر کہانی کا اصل جوہر اس کے ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی ردعمل میں پوشیدہ ہے۔ اس افسانے کے نفسیاتی تجزیے میں کئی گہرے اور پیچیدہ پہلو سامنے آتے ہیں، جن میں قید و بند کے اثرات، ذہنی دباؤ، شناخت کا بحران اور جبر کے خلاف مزاحمت شامل ہیں۔

وکٹوریہ اگرچہ ایک غیر انسانی کردار ہے، لیکن حسن منظر نے اپنے افسانے میں اس کی نفسیاتی کیفیات کو نہایت گہرائی اور مہارت سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے وکٹوریہ کے جذبات، احساسات اور داخلی کشمکش کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ قاری کو ایک جیتے جاگتے کردار کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ مصنف نے مختلف زاویوں سے اس کی نفسیاتی حالت کی عکاسی کی ہے، جیسے اس کے قید اور جبر، بے چینی، خوف، تنہائی، ناامیدی اور بے بسی کے جذبات کو اجاگر کیا ہے۔ وکٹوریا کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ کرتے وقت سب سے پہلے ہمیں قید اور جبری تجربات کے اثرات کو دیکھنا ہوگا۔ نفسیات میں ایک اصطلاح "قیدی ذہنیت" (Prisoner Mentality) کہلاتی ہے، جس کے مطابق جب کوئی مسلسل قید اور جبر میں رہے، تو اس کی شخصیت میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ وکٹوریا ابتدا میں اپنی فطری جبلت کے مطابق ردِ عمل دیتی ہے، مگر جیسے جیسے وہ سائنسی تجربات کا شکار ہوتی ہے، اس کی ذہنی حالت غیر متوازن ہونے لگتی ہے۔ وہ اپنی آزادی کھو دینے پر بے چینی محسوس کرتی ہے، جو ایک عام نفسیاتی رویہ ہے جو قیدیوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی بے چینی، اس کا پنجروں میں اضطراب سے گھومنا، اور اس کی مسلسل بدلتی ہوئی جسمانی حرکات درحقیقت اس کے ذہنی تناؤ (Anxiety) اور بے بسی (Helplessness) کی عکاسی کرتے ہیں۔ نفسیاتی تحقیقات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اگر کوئی جاندار طویل عرصے تک دباؤ (Stress) کا شکار رہے، تو اس کا دماغ اس کیفیت سے نپٹنے کے لیے مختلف دفاعی میکانزم اپناتا ہے۔ وکٹوریا کی حالت بھی اسی عمل کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، جہاں وہ اپنے اردگرد کے حالات کو قبول کرنے اور ان کے خلاف مزاحمت کرنے کے درمیان جھولتی رہتی ہے۔

وکٹوریا پر زبردستی افزائشِ نسل کے تجربات کیے جاتے ہیں، جو نہ صرف اس کی جسمانی بلکہ ذہنی صحت پر بھی گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر، جنسی جبر (Sexual Coercion) کا شکار ہونے والے افراد شدید صدمے (Trauma) سے گزرتے ہیں۔ وہ ذہنی تناؤ، خوف، اور خود کی بے بسی کے احساس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وکٹوریا کے معاملے میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے کہ وہ ہیکٹر نامی نر گوریلا کے ساتھ ملاپ سے گریز کرتی ہے، مگر اس پر جبر کیا جاتا ہے۔ وکٹوریا کا حمل ٹھہرنا اور پھر اسقاطِ حمل کا شکار ہونا اس کے نفسیاتی انہدام (Psychological Breakdown) کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ماں بننے کا احساس محض حیاتیاتی نہیں بلکہ نفسیاتی بھی ہوتا ہے۔ جب ایک عورت (یا کوئی بھی مادہ جاندار) حمل کے مرحلے سے گزرتی ہے، تو اس کے دماغ میں کئی نفسیاتی تبدیلیاں آتی ہیں۔ وکٹوریا کے لیے یہ حمل ایک الجھن کا سبب بنتا ہے۔ یہ اس کے اختیار کے خلاف ہے، اس کے حالات کے برعکس ہے، اور اس کے لیے ایک دباؤ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسقاطِ حمل کا واقعہ اس کی نفسیاتی شکستگی کو مزید بڑھا دیتا ہے، کیونکہ وہ ایک ایسا تجربہ کرتی ہے جسے کھونا اور نہ کھونا، دونوں ہی اذیت ناک ہیں۔

وکٹوریا کے کردار میں ہمیں ایک نفسیاتی صدمہ (Trauma) نظر آتا ہے، جو مسلسل جبر اور غیر فطری تجربات کا نتیجہ ہے۔ صدمے کا شکار جاندار یا تو مکمل خاموشی اور بے حسی (Numbness) کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر شدید ردِ عمل (Hyperactivity) دکھاتا ہے۔ وکٹوریا کے اندر خوف، بے یقینی، اور غصے کے جذبات ایک ساتھ پنپتے ہیں، جو اس کے رویے میں غیر معمولی تبدیلیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ آخر روتی چیختی بچے کو جنم دے کر خود اس اذیت ناک صورتحال سے نجات پا جاتی ہے۔ اس منظر کو ڈاکٹر حسن منظر نے افسانے میں یوں پیش کیا ہے:

"وکٹوریا نے بچے کو نرمی سے اپنے پتوں اور شاخوں کے بستر پر لٹا دیا اور قفس کی پشت کی طرف جاتے ہوے غیر مسلسل بھونکنے کی سی چند آوازیں نکالیں، جیسے اپنے مقدر کو رو رہی ہو۔ جب ہم اس کی آوازیں اچانک بند ہونے پر اس کے قفس میں پہنچے تو بچہ پتوں اور کونپلوں کی ڈھیری پر سو رہا تھا۔ وکٹوریا کے بارے میں بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ شہر کے مردہ عجائب گھر کی زینت بنے گی کیوں کہ اس کی لاش ٹیکسی ڈرسٹ کے حوالے کر دی گئی ہے۔ وکٹوریا کا ہمارا کل پانچ سو ساٹھ دن کا ساتھ رہا۔"(۲)

وکٹوریا کی شناخت بھی ایک بحران (Identity Crisis) کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ ایک گوریلا ہوتے ہوئے بھی انسانی تجربات کا حصہ بن رہی ہے، جس کے نتیجے میں وہ اپنی اصل فطرت سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کیفیت انسانوں میں بھی دیکھی جاتی ہے، خاص طور پر جب وہ کسی جبر یا کنٹرول میں ہوں، جہاں وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے اور انہیں ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ نفسیاتی طور پر، جب ایک جاندار طویل عرصے تک جبر میں رہے، تو یا تو وہ مکمل طور پر ہتھیار ڈال دیتا ہے، یا پھر کسی نہ کسی شکل میں بغاوت کرتا ہے۔ وکٹوریا کے کردار میں یہ بغاوت خاموش مزاحمت (Passive Resistance) کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ وہ حمل کے دوران غیر معمولی ردِ عمل ظاہر کرتی ہے، کھانے سے انکار کرتی ہے، اور رویے میں بے چینی دکھاتی ہے۔ وہ مکمل طور پر قابو میں آنے سے انکار کرتی ہے، جو اس کی اندرونی جدوجہد کو ظاہر کرتا ہے۔

کہانی میں سائنس دانوں کے کردار بھی نفسیاتی طور پر دلچسپ ہیں۔ نیٹ، بوب اور جوڈی وکٹوریا کو محض ایک تجرباتی ماڈل کے طور پر دیکھتے ہیں، جو درحقیقت انسان کے اس رویے کو ظاہر کرتا ہے جہاں وہ دوسروں کی تکالیف کو نظرانداز کر کے اپنے مقاصد کو مقدم رکھتا ہے۔ نیٹ کا کردار خاص طور پر دلچسپ ہے، کیونکہ وہ رفتہ رفتہ وکٹوریا کے ساتھ ایک جذباتی تعلق محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں سائنسی پیشہ ورانہ رویہ اور انسانی ہمدردی کے جذبات آپس میں ٹکراتے ہیں۔ نیٹ کے اندر وکٹوریا کے لیے ہمدردی جنم لیتی ہے، لیکن وہ سائنسی اصولوں اور اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے درمیان الجھا رہتا ہے، جو ایک عام نفسیاتی کشمکش ہے۔

افسانے میں ایک ایسا ماحول دکھایا گیا ہے جہاں انسان کو برتر حیثیت دی گئی ہے اور جانوروں پر تجربات کو ایک معمول کے طور پر لیا جاتا ہے۔ نیٹ، جوڈی، اور بوب جیسے سائنسدان اپنے تحقیقی عمل میں اس حد تک مگن ہیں کہ وہ اخلاقیات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ جب وکٹوریا پر مختلف طریقوں سے افزائش نسل کے تجربات کیے جاتے ہیں، تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا علم کی ترقی کے نام پر اخلاقی حدود کو نظرانداز کرنا جائز ہے؟ نیٹ کا رویہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ وہ ابتدائی طور پر وکٹوریا کو محض ایک تجرباتی نمونہ سمجھتا ہے، لیکن جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے، اس کے اندر ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس کے باوجود، وہ اپنی سائنسی ذمہ داری کو انسانی ہمدردی پر ترجیح دیتا ہے۔

افسانے میں گوریلا وکٹوریا کو محض ایک حیوان کے طور پر نہیں بلکہ ایک جاندار ہستی کے طور پر دکھایا گیا ہے جو جذبات، احساسات اور نفسیاتی مسائل کا سامنا کرتی ہے۔ اس کے کردار کو پڑھ کر قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی انسانوں کی طرح خوشی، غم، اداسی، اور بے بسی جیسے جذبات رکھتی ہے۔ یہ مصنف کا کمال فن ہے کہ انھوں نے ایک جانور کی نفسیات کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ وکٹوریا کے اندر تنہائی اور محرومی کا احساس شدت اختیار کر لیتا ہے، اور وہ ایک قیدی کی طرح جینے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس کی بے چینی، نیند کی کمی، اور افسردگی ایک گہرے نفسیاتی المیے کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ سب اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ جذباتی اور ذہنی دباؤ کا شکار صرف انسان نہیں ہوتے، بلکہ دوسرے جاندار بھی اسی طرح کی کیفیات سے گزرتے ہیں۔ وکٹوریا پر زبردستی افزائش نسل کے تجربات کیے جاتے ہیں، جو ایک طاقتور سماجی استعارہ بنتے ہیں۔ وکٹوریا کو ہیکٹر نامی گوریلا کے ساتھ ملاپ پر مجبور کیا جاتا ہے، حالانکہ وہ اس عمل سے بے زاری محسوس کرتی ہے۔ بعد میں، اس کا اسقاطِ حمل ہو

جانانہ صرف حیاتیاتی تجربات کی ناکامی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ زبردستی کیے گئے فیصلوں کے نتائج کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ یہ صورتحال درحقیقت خواتین کے جسم پر کیے جانے والے جبر کی علامت بھی بن سکتی ہے۔ انسانی سماج میں خواتین پر زبردستی شادی، بچے پیدا کرنے اور جسمانی کنٹرول جیسے موضوعات اکثر زیرِ بحث آتے ہیں، اور وکٹوریا کا کردار اسی دباؤ کی علامتی عکاسی کرتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس افسانے میں انسانی نفسیات، جبر کے اثرات، اور شناخت کے بحران جیسے نفسیاتی موضوعات نمایاں ہیں۔ وکٹوریا کی بے بسی، صدمے، اور مزاحمت کی کہانی دراصل کسی بھی جاندار پر ہونے والے جبر اور اس کے نفسیاتی اثرات کو سمجھنے کے لیے ایک علامتی مطالعہ فراہم کرتی ہے۔ یہ افسانہ سائنسی ترقی اور اخلاقی سوالات کے ساتھ ساتھ، انسانی اور غیر انسانی مخلوقات کے درمیان تعلقات میں طاقت کے توازن کو بھی نفسیاتی زاویے سے پرکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

حسن منظر کے ایک اور افسانے "بیچارے" کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے کرداروں کی داخلی کیفیت، ان کے شعوری اور لاشعوری محرکات، اور ان کے طرزِ عمل کے پس پردہ نفسیاتی پیچیدگیوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے فرد کے تجربات پر مبنی ہے جو اپنے ماضی، شناخت اور تعلقات کے حوالے سے ایک کشمکش میں مبتلا ہے۔

کہانی کے مرکزی کردار (راوی) کو جب ماضی میں اپنے فیصلوں پر نظر ڈالنے کا موقع ملتا ہے، تو اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ پاکستان آتے ہی "نائمہ" اور اس کے خاندان سے ملاقات کر لینا چاہیے تھا۔ یہ خیال دراصل اس کے اندر موجود ایک دیرینہ احساسِ ندامت کو ظاہر کرتا ہے، جس کی جڑیں اس کے شناختی بحران اور اپنے رویوں کے بارے میں لاحق شکوک و شبہات میں پیوست ہیں۔ اس کے مطابق، پہلی ملاقات جتنی بھی طویل ہو، وہ وہی قربت پیدا نہیں کر سکتی جو دو مختصر ملاقاتوں کے درمیان وقفہ تخلیق کر سکتا ہے۔ یہ سوچ دراصل انسانی نفسیات میں تعلقات کی پیچیدگی اور فاصلے کے اثرات کو اجاگر کرتی ہے۔

افسانے میں نائمہ کے گھر کا ماحول، اس کے گھر کے افراد اور وہاں کی فضا ایک مخصوص نفسیاتی کیفیت کو آشکار کرتے ہیں۔ جب مرکزی کردار نائمہ کے بھائی کے ساتھ نیم تاریک زینوں سے تیسری منزل تک پہنچتا ہے، تو یہ پورا منظر ایک نفسیاتی علامت بن جاتا ہے، جو اس کے ماضی میں سفر اور نائمہ کے خاندان کے ساتھ اس کے تعلق کی غیر واضح حیثیت کو نمایاں کرتا ہے۔ جب وہ کمرے میں بیٹھ کر نائمہ اور اس کے گھر والوں سے ملتا ہے، تو وہ خود کو ایک اجنبی محسوس کرتا ہے، حالانکہ وہ ان سے پہلے بھی مل چکا ہوتا ہے۔ یہ کیفیت ایک نفسیاتی الجھن کو ظاہر کرتی ہے جس میں فرد خود کو اپنے ماحول میں مکمل طور پر ضم کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ نائمہ کی ماں، بڑی بہن اور آخر میں نائمہ کی آمد، سبھی کرداروں کی جذباتی پیچیدگیوں کو واضح کرتی ہے۔ خاص طور پر نائمہ کے بارے میں راوی (مرکزی کردار) کا "دنگ رہ جانا" اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ اپنے تصور میں جو تصویر بنائے ہوئے تھا، حقیقت اس سے کہیں مختلف نکلی۔ یہ تضاد انسانی نفسیات میں اس میلانی (melancholic) کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جہاں ماضی کی یادیں حقیقت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں، اور جب ماضی کا سامنا ہوتا ہے تو وہ ایک ناقابلِ تسخیر خلیج کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

اس کہانی میں موسیقی ایک انتہائی اہم نفسیاتی عنصر کے طور پر سامنے آتی ہے۔ پہلے نائمہ کا گانے سے گریز کرنا اور آخر کار اپنی ماں کے اصرار پر گانے کے لیے تیار ہونا، دراصل اس کے اندر موجود جذباتی جھجک کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ جھجک ایک نفسیاتی تحفظ (defense mechanism) کے طور پر دیکھی جا سکتی ہے، جہاں وہ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے۔ جب وہ گانے لگتی ہے تو راوی کو احساس ہوتا ہے کہ اس کی آواز میں وہ مضبوطی نہیں جو ہونی چاہیے تھی۔ یہاں یہ نکتہ نفسیاتی طور پر نہایت اہم ہے، کیونکہ یہ نائمہ کی شکستہ شخصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی نمائندگی کرتی ہے جو شاید اپنی خواہشات، خوابوں یا فن کو مکمل طور پر نہیں پا سکی، اور اب ایک مجبور

فرد کے طور پر سامنے آتی ہے۔ پرانے گراموفون ریکارڈز اور ان کے ذریعے نائمہ کے والد کی یاد کو زندہ رکھنے کا تصور بھی گہری نفسیاتی معنویت رکھتا ہے۔ ریکارڈز، جو اپنی پرانی حالت کے باوجود سنبھال کر رکھے گئے ہیں، ایک ایسے ماضی کی علامت ہیں جو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے لیکن اسے زبردستی محفوظ رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جب نائمہ اور اس کی ماں بانسری کی تان پر جذباتی ردعمل دیتی ہیں، تو یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ اپنے ماضی سے جذباتی طور پر جڑی ہوئی ہیں اور اسی ماضی میں پناہ تلاش کرتی ہیں۔

افسانے میں راوی (مرکزی کردار) کا ان سب کے چہروں سے نظریں چرانا، ان کی غربت اور بے بسی کو دیکھ کر ترس کھانا، اور آخر میں ہوٹل واپس جاتے ہوئے اپنے نوٹس پر نظر ڈال کر یہ سوچنا کہ وہ تمام چیزیں کتنی بے معنی ہیں، اس کے اندرونی بحران اور جذباتی شکست وریخت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کی ساری علمی و تاریخی معلومات، جو اس نے مختلف شہروں اور مقامات کے بارے میں جمع کی تھیں، اسے غیر متعلقہ محسوس ہوتی ہیں، کیونکہ اس لمحے میں، اس کا سامنا ایک زیادہ گہری حقیقت سے ہوتا ہے۔ ایک انسانی زندگی کی ناتمامی، ایک خاندان کی مایوسی، اور ایک ایسی دنیا جو اپنی شناخت اور جڑوں کے بحران سے دوچار ہے۔ اس کا کیتھی کے ساتھ آخری مکالمہ، جہاں وہ ٹیپ ریکارڈر کے متعلق بات کرتی ہے، اس کہانی کا ایک اور اہم نفسیاتی پہلو واضح کرتا ہے۔ کیتھی کے مطابق اگر مرکزی کردار یہ ٹیپ ان لوگوں کو دے دیتا ہے تو وہ یہ سوچیں گے کہ وہ انہیں صرف اسی ایک چیز سے جڑا ہوا سمجھتا ہے۔ یہاں ایک نفسیاتی سچائی سامنے آتی ہے کہ انسانی تعلقات محض مادی اشیاء سے نہیں جڑے ہوتے بلکہ احساسات اور جذبات سے بنتے ہیں۔ افسانے کے آخر میں جب راوی کیتھی سے پوچھتا ہے کہ کیا وہ اس کے ساتھ چلنا چاہتی ہے، اور وہ جواب دیتی ہے کہ "بالکل، میرے گھر تک؟" دراصل یہ الفاظ ایک نفسیاتی علامت بن جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسے فرد کی داخلی کیفیت کا مظہر ہے جو کسی نہ کسی طور پر جڑنے، تسلی پانے، اور ماضی کے دکھوں سے فرار چاہتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ اسی الجھن میں پھنسا رہتا ہے۔ اس صورت حال کو مصنف نے یوں بیان کیا ہے:

> "کیتھی نے کہا میں فیصلہ کر سکتی ہوں۔ تم اس دو سو فیٹ اسکاچ ٹیپ کو یہیں پڑا رہنے دو۔ مجھے معلوم ہے اس میں کیا ہے جو تم اس خاندان کو دینا چاہتے ہو۔ لیکن اُسے سننے کیلئے ان کے پاس ٹیپ رکارڈر ہوگا؟ میں انہیں ایک بھیج سکتا ہوں، میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور اس سے انہیں احساس ہوگا کہ تم یہ تاثر لے کر وہاں سے آئے ہو کہ اُس انٹرمزو کے سوا ان کے پاس کچھ اور نہیں ہے۔ یا انکی غربت کا احساس کہ وہ ایک چیز سے چپکے ہوئے ہیں اس نے پیکٹ کو میز پر سے اٹھا کر دیکھا اور دوبارہ وہیں رکھ دیا۔ سے نہیں رکھے رہو۔ رکھتے وقت اسکے سامنے ہونے سے تمہارے افراد کردار نہیں بنیں گے۔
>
> ''کچھ دیر خاموش رہ کر میں نے کہا Care for a walk (چلنے کا ارادہ ہے؟) اس نے کہا بالکل۔ میرے گھر تک؟"(۳)

جب راوی کیتھی سے پوچھتا ہے "Care for a walk" تو یہ سوال اس کی ایک داخلی کیفیت کا عکاس ہے۔ وہ کیتھی کے ساتھ ایک ذاتی تعلق کے قیام کی کوشش کر رہا ہے، لیکن اس میں ایک قسم کی عدم اعتماد اور بیگانگی بھی موجود ہے۔ یہ سوال کسی جذباتی کمی کو پورا کرنے کی کوشش ہے، جہاں مرکزی کردار کی کوشش ہے کہ وہ کیتھی کے ساتھ ایک نیا رشتہ قائم کرے یا کم از کم اپنی ذہنی پریشانیوں سے نکل کر کسی دوسری دنیا میں قدم رکھے۔ کیتھی کا جواب "بالکل۔ میرے گھر تک؟" ایک نفسیاتی سطح پر مختلف معانی رکھتا ہے۔ یہ سوال نہ صرف ایک دعوت ہے بلکہ اس کیتھی کی طرف سے ایک طرح کا امتحان بھی ہو سکتا ہے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ مرکزی کردار کتنا کھلا ہے اور کیا وہ حقیقتاً اس کے اندرونی جہتوں کو سمجھ سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا یہ کہنا کہ "میرے گھر تک؟" ایک طرح سے ان دونوں کے درمیان ایک تعلق کی نوعیت اور ان کی نفسیاتی حالت

کو جانچنے کا عمل بن جاتا ہے۔ دراصل یہ افسانہ نفسیاتی حقیقت نگاری (psychological realism) کی ایک عمدہ مثال ہے جو انسانی نفسیات میں بیگانگی، شناخت کے بحران، عدم تحفظ، اور جذباتی وابستگی کی خواہش کو نمایاں کرتی ہے۔ حسن منظر نے بہت باریک بینی سے ان نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور ان کرداروں کی الجھنوں کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری خود کو ان کی ذہنی کیفیت کے قریب محسوس کرتا ہے۔

حسن منظر کا افسانہ ''للّی'' بھی نفسیاتی عناصر سے بھرپور ہے۔ اس میں فرد کی اندرونی کشمکش، سماجی رویوں کی سخت گیری، اور شرم و گناہ کے تصورات کے باہمی تصادم کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ کہانی نہ صرف ایک فرد کے المیے کو بیان کرتی ہے بلکہ ایک پورے سماجی ڈھانچے پر بھی گہرا طنز ہے، جہاں مذہبی اور اخلاقی اصولوں کے نام پر انسانی جذبات کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ افسانے کے کلیدی کردار، ایثار الدین، کو ایک ایسے بحران کا سامنا ہے جو جسمانی، ذہنی، اور سماجی سطحوں پر محیط ہے۔ وہ ایک ایسے مسئلے سے دوچار ہے جسے وہ سماج کے خوف سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس کوشش میں مزید ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے گناہ کا تصور محض ایک مذہبی اصطلاح ہے جو اس کی عملی زندگی پر اثرانداز نہیں ہوتا، لیکن سماجی تضحیک اور شرمندگی کا خوف اسے شدید اضطراب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

اس کہانی میں شرم اور گناہ کے درمیان ایک نمایاں فرق دکھایا گیا ہے۔ گناہ ایک مذہبی و نظریاتی تصور ہے، جسے فرد اپنے ضمیر یا خدا کے ساتھ جوڑ کر دیکھتا ہے، جبکہ شرم ایک سماجی حقیقت ہے، جو دوسرے لوگوں کے ردعمل پر منحصر ہوتی ہے۔ ایثار الدین کے لیے اصل مسئلہ گناہ کا نہیں، بلکہ اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ وہ بیمار ہے، اور اس بیماری کے باعث لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے، اس پر انگلیاں اٹھائیں گے، اور اسے معاشرتی طور پر تنہا کر دیں گے۔

یہاں حسن منظر نے جنوبی ایشیائی معاشرے میں موجود اس دوہرے معیار کو اجاگر کیا ہے، جہاں لوگ خود بھی گناہ کرتے ہیں، لیکن جب کسی کا گناہ منظرِ عام پر آ جائے تو وہ اسے معاف کرنے کے بجائے اس کی تذلیل کرنے میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔ ایثار الدین کا جنسی اضطراب بھی اس کہانی کا ایک اہم پہلو ہے۔ وہ اپنی بیماری کے علاج کے لیے ایک ایسی عورت کی تلاش میں ہے جو "فی الحقیقت کنواری" ہو، تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنی بیماری سے نجات حاصل کر سکے۔ یہ سوچ اس کے لاشعور میں موجود Displacement کا ایک مظہر ہے، جہاں فرد اپنے اصل مسئلے کا سامنا کرنے کے بجائے ایک علامتی حل تلاش کرتا ہے۔ اس کی جنسی کشمکش صرف جسمانی خواہش تک محدود نہیں، بلکہ اس کی شناخت کے بحران سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ افسانے کے آغاز میں ہی اس کی شناخت پر سوال اٹھایا جاتا ہے:

"ایثار دین کو ایثار الدین کہنے سے کیا فائدہ جب اسے اس نام سے قصبے بھر میں کوئی نہیں جانتا؟"(۴)

یہ جملہ اس کے اندرونی بحران کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ اپنی اصل پہچان کھو چکا ہے اور اپنے گاؤں کے سخت گیر رویوں سے جڑا ہونے کے باوجود ان میں مکمل طور پر ضم نہیں ہو سکا۔ اس کی بیوی للّی بھی اسی بحران کا شکار ہے، جسے سماجی بے حسی اور مردانہ جبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایثار الدین کے خوف کا بنیادی محرک بیماری نہیں، بلکہ اس کا انکشاف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر اس کی بیماری ظاہر ہو گئی، تو اسے تیمارداری کے بجائے نفرت اور تضحیک کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ Stigma کا خوف ہے، جو نفسیاتی سماجیات میں ایک اہم موضوع ہے۔ حسن منظر نے یہ دکھایا ہے کہ بعض اوقات انسان بیماری یا گناہ سے زیادہ، اس کے منظرِ عام آنے سے ڈرتا ہے۔

یہی خوف للّی کے کردار میں بھی نظر آتا ہے۔ جب وہ ایک صدمے سے گزرتی ہے، تو وہ اپنی اذیت کو الفاظ میں بیان نہیں کر پاتی۔ اس کا سوال:

"کیا میری شادی پوری ہو گئی؟" لیکن اس خیال کے آتے ہے وہ ڈر گئی اور بات کو اپنے سینے میں دبا لیا۔"(۵)

یہاں واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنی حق بات کو بیان کرنے سے بھی خوفزدہ ہے، کیونکہ وہ جانتی ہے کہ معاشرہ اسے معاف نہیں کرے گا، بلکہ مزید الزام تراشی کرے گا۔ افسانہ اس حقیقت کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ مرد اپنی مردانگی کا یقین صرف اسی وقت حاصل کرتے ہیں جب وہ کسی عورت پر تسلط جتا سکیں۔ ایثار الدین کی نفسیاتی کشمکش میں مردانہ بالادستی کا یہ عنصر بھی شامل ہے۔ وہ اپنی بیماری کو چھپانے کے لیے دوسری عورتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ وہ عورت کو صرف اپنی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ یہ سماج کا وہ رویہ ہے جس میں عورت پر ہر الزام لگایا جاتا ہے، جبکہ مرد اپنے افعال کی جواز تراشی میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہی رویہ للّی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے جسم پر لگے زخموں کو لوگ "بداعمالیوں کا نتیجہ" سمجھتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک سنگین المیے کا شکار ہے۔ لیکن رسول پور کے مذہبی انتہا پسند لوگ اس کی نماز جنازہ تک پڑھنے سے انکار کر دیتے ہیں، کیونکہ خودکشی کو وہ حرام سمجھتے ہیں۔

افسانہ ''للّی'' میں نہ صرف فرد کی داخلی نفسیاتی پیچیدگیوں کو نمایاں کیا گیا ہے، بلکہ پورے سماجی ڈھانچے پر ایک گہرا سوالیہ نشان بھی ثبت کیا ہے۔ ایثار الدین اور للّی کی کہانی یہ دکھاتی ہے کہ کیسے ایک معاشرہ فرد کے اندرونی بحرانوں کو مزید گہرا کر دیتا ہے، اور کیسے سماجی اصول انسان کو اپنی سچائی بیان کرنے سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ یہ کہانی انسان کے وجود، اس کی شناخت، اس کے خوف اور اس کی بے بسی کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں مذہبی شدت پسندی، جنسی جبر، اور سماجی بے حسی جیسے مسائل کو انتہائی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔ حسن منظر نے نہ صرف ایثار الدین کے ذہنی انتشار کو دکھایا، بلکہ للّی کے کردار کے ذریعے بھی اس معاشرتی بے حسی پر گہری ضرب لگائی ہے، جہاں عورت کو ہر حال میں الزام کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اور مرد اپنے گناہ کو کسی نہ کسی طریقے سے چھپانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

حسن منظر کا افسانہ "ہمارے دن، ہمارا زمانہ" نفسیات کی کئی پرتوں پر مشتمل ہے۔ اس کہانی میں ایک نوجوان لڑکے کے تجربات، اس کے نفسیاتی اتار چڑھاؤ، اس کے خاندانی پس منظر اور اس کے سماجی ماحول کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانے میں ایک ایسے نوجوان کی داخلی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے، جو داخلی خلفشار، خاندانی دباؤ اور معاشرتی حقیقتوں کے بیچ الجھا ہوا ہے۔ نوجوان لڑکے (مرکزی کردار) کی ماں اُس پر مکمل اختیار رکھتی ہے، لیکن اس کی زبان اور رویہ اسے شرمندہ کرتا ہے، خاص طور پر جب وہ دوستوں کے سامنے اس سے بازپرس کرتی ہے۔ مرقوم ہے:

> "میرے کو ممی کے ایسے بولنے پر ہمیشہ خار آتا ہے۔ جب وہ میرے اردو بولنے والے دوستوں کے سامنے اس طرح بات کرتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے لگتے ہیں اور میں سمجھ جاتا ہوں اب باہر نکل کر چھیڑ خالی کرینگے۔"(۶)

اقتباس سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ نوجوان کے اندر شدید احساسِ ندامت اور بے بسی موجود ہے۔ وہ اپنی ماں کی زبان اور انداز سے ناخوش ہے، کیونکہ اس کے دوست اس کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن وہ اس سے محبت بھی کرتا ہے۔ اس کا یہ الجھا ہوا رشتہ ایک نفسیاتی الجھن کو ظاہر کرتا ہے جس میں وہ ایک طرف ماں کے احکامات ماننا چاہتا ہے اور دوسری طرف اپنی خودمختاری برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ دراصل ماں اس پر شک کرتی ہے کہ وہ گھر کا سامان اور پیسے چوری کرتا ہے۔ ماں کا بار بار شک کرنا لڑکے میں گناہ کے احساس کو بڑھاتا ہے۔ یہ ایک طرح کی نفسیاتی جبر کی صورت ہے، جس میں وہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگتا ہے، چاہے وہ چوری کرے یا نہ کرے۔ اسی لیے آخر میں وہ پیسے چوری کر کے لوٹانے کا ارادہ کر لیتا ہے، تاکہ ماں کو تسلی ہو سکے۔

کہانی میں اس نوجوان کے بڑے بھائی کا ذکر خاص اہمیت رکھتا ہے، جسے کمیونٹی سے باہر شادی کرنے کی سزا دی گئی۔ بڑے بھائی کو کسی کمیونٹی باہر کی چھوکری سے چھپ کر سول میرج کر لینے پر لڑکی کے گھر والوں نے غنڈوں سے اتنا پٹوایا تھا کہ جب وہ پناہ لینے کو بازو کی مسجد میں گھسنے لگا تو غنڈوں کے ڈر کے مارے مسجد والوں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور وہ وہیں سیڑھیوں پر گر پڑتا ہے۔ یہ واقعہ مرکزی کردار کے ذہن

پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ بھی کوئی ایسا قدم اٹھائے گا، تو اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ یہ خوف اس کی نفسیات میں مستقل موجود رہتا ہے اور اسے بے یقینی میں مبتلا رکھتا ہے۔ یہ نوجوان زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بار بار ٹکراتا ہے، اور ایک لمحے میں خودکشی کے بارے میں بھی سوچتا ہے:

> "راستے بھر میں سوچتا آیا میرے لئے کیا بہتر رہے گا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں لال روشنی والے باڑے سے ہو کر نہیں آیا ہوں جس کا صرف ذکر میں نے اپنے بڑے ساتھیوں سے سنا تھا اور کئی بار خیال آیا بجائے گھر جانے کے راستے ہی میں کہیں اپنا خاتمہ کر دوں یا دریا پر چلا جاؤں۔"(۷)

یہاں اس کے اندر کی بے بسی اور اضطراب مزید واضح ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں سے بچنا چاہتا ہے، لیکن آخر میں خود گھر کی طرف جاتے دیکھتا ہے، جو کہ اس کے ذہن میں موجود امید کی علامت ہو سکتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار اپنے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہونے کی کوشش کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی وہ خود کو ان سے الگ بھی محسوس کرتا ہے۔ مرکزی کردار غیر یقینی کی کیفیت میں ہے۔ وہ اس تقسیم کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، مگر وہ خود کو کسی ایک شناخت میں قید نہیں کر پاتا۔ اس کی یہ الجھن ایک نفسیاتی کشمکش کی نشاندہی کرتی ہے، جو اکثر نوجوانی میں دیکھی جاتی ہے، جب فرد اپنی جگہ اور پہچان بنانے کی جدوجہد میں ہوتا ہے۔

افسانے کے آخر میں مرکزی کردار اپنی ماں کو دکھ نہیں دینا چاہتا، اور پیسے لوٹانے کا منصوبہ بناتا ہے۔ اور خود سے ہی کہتا رہتا ہے کہ جب بھی پیسے ملے میں اُسے اُسی کی پیٹی میں سے نکال کر دے۔ دونگا اور کہونگا: امی یہ رہا تیرا اس دن والا دس کا نوٹ۔ نوجوان کا یہ عمل ایک لاشعوری معافی کی کوشش ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی ماں اس پر دوبارہ اعتماد کرے، حالانکہ وہ حقیقتاً چوری کر چکا ہے۔ یہ نفسیاتی الجھن اکثر ان نوجوانوں میں دیکھی جاتی ہے جو محبت اور گناہ کے احساس کے درمیان پھنسے ہوتے ہیں۔

حسن منظر نے اس افسانے میں ایک عام شہری لڑکے کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بے حد مہارت سے بیان کیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک ایسی دنیا میں رہ رہا ہے جہاں تشدد، طبقاتی تقسیم، والدین کی سختی، جرم اور بغاوت سب کچھ موجود ہے۔ وہ ان سب کے درمیان اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتا ہے، مگر لاشعوری طور پر وہ اپنے گھر اور ماں سے جڑا ہوا ہے۔ کہانی کا انجام ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ آیا یہ نوجوان اپنی نفسیاتی کشمکش سے نکل پائے گا، یا اسی نظام کا ایک اور شکار بن جائے گا۔

حسن منظر نے افسانہ ''سفید آدمی کی دنیا'' میں نوآبادیاتی ذہنیت، نسل پرستی، اور شناختی بحران جیسے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی موضوعات کو اجاگر کیا ہے۔ کہانی ایک بچے کے نقطہ نظر سے بیان کی گئی ہے جو اپنے ارد گرد کی دنیا کو معصومیت اور تجسس سے دیکھتا ہے، مگر وہ جوابات جو اسے ملتے ہیں، اس کے لیے مزید سوالات پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ کہانی سماجی، تاریخی، اور نفسیاتی سطح پر ایک پیچیدہ منظر نامہ پیش کرتی ہے، جہاں سفید فام افراد کی طاقت اور مراعات یافتہ حیثیت، اور دوسری طرف افریقی اور ایشیائی باشندوں کی محکومیت، مرکزی کردار کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ مرقوم ہے:

> "مجھے اس بڑھیا سے نفرت ہے، وہ اپنے گھر میں اکیلی رہتی ہے اور اسکا گھر ایسے علاقے میں ہے جہاں بس بہت امیر آدمی رہ سکتے ہیں۔ وہ کہتی ہے اس کے علاقے میں نہ افریقہ کے لوگ ہیں نہ ایشیا کے، صرف گورے لوگ ہیں۔"(۸)

یہ اقتباس راوی کے لاشعوری احساسِ کمتری اور داخلی خلفشار کو اجاگر کرتا ہے۔ کہانی کا راوی ایک بچہ ہے جو سفید فام دادی سے نفرت کرتا ہے، مگر اس کی نفرت صرف ایک ذاتی یا جذباتی معاملہ نہیں بلکہ سماجی تفریق اور عدم مساوات کا نتیجہ ہے۔ اس کی دادی کے تعصب بھرے خیالات، جو گورے اور غیر گورے کے درمیان واضح لکیر کھینچتے ہیں، راوی کے ذہن میں ایک نفسیاتی کشمکش پیدا کرتے ہیں۔ یہ بچہ محسوس کرتا ہے کہ سفید فام افراد کے لیے مخصوص علاقوں میں افریقی اور ایشیائی لوگوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اس کی دادی کا یہ امتیازی رویہ، بچے کے لیے ایک جذباتی صدمے کا باعث بنتا ہے، کیونکہ وہ خود بھی ایک ایسی دنیا کا حصہ ہے جو نوآبادیاتی نظام کے تحت تقسیم شدہ ہے۔ اس احساسِ محرومی کی وجہ سے وہ اپنی دادی کو 'بڑھیا' اور 'زہر' جیسے سخت الفاظ سے یاد کرتا ہے، جو اس کے اندرونی غصے اور جذباتی لاچاری کو ظاہر کرتا ہے۔

یہ افسانہ نفسیاتی طور پر، یہ ایک ایسے بچے کی الجھن کو پیش کرتا ہے جو نہ صرف اپنی شناخت سے نبرد آزما ہے بلکہ اسے خاندان کے اندر بھی تعصب اور نسل پرستی کا سامنا ہے۔ بچہ ابھی اپنے جذبات اور سماجی حقیقتوں کو مکمل طور پر سمجھنے کے قابل نہیں، مگر اس کے ذہن میں سفید فام دنیا کی منافقت کے خلاف ایک واضح ردِ عمل پیدا ہو رہا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "پھر میں نے ایک دم وہ سوال کیا جو آج دوپہر سے کرنا چاہ رہا تھا۔ ٹھیک ہے ٹالسٹائی نے اچھی کہانیاں لکھی ہونگی لیکن میرا خیال ہے ٹینا جھوٹ بولتی ہے کہ اُس نے کہا تھا۔ فٹ، سر سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک حقیقت میں ایک انسان کو زمین چاہیے ہوتی ہے۔
>
> میرا سوال یہ ہے: ایک سفید آدمی کو کتنی زمین چاہیے ہوتی ہے؟"(۹)

یہ اقتباس بچے کی ذہنی بلوغت اور اس کے اندر پیدا ہونے والے شعور کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ دنیا کو ایک خاص زاویے سے دیکھنے لگا ہے، جہاں طاقتور اقوام زیادہ سے زیادہ زمین اور وسائل پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں۔ یہاں وہ ایک بڑے سوال کی طرف اشارہ کر رہا ہے: "ایک سفید آدمی کو کتنی زمین چاہیے؟" یہ سوال براہِ راست نوآبادیاتی استحصال کی طرف اشارہ کرتا ہے، جہاں سفید فام طاقتیں مختلف خطوں پر قابض ہو کر مقامی آبادیوں کو بے دخل کر رہی تھیں۔ یہ سوال بچے کی شعوری نشوونما کی علامت ہے۔ ابتدا میں وہ اپنے ارد گرد کی دنیا کو معصومیت سے دیکھتا ہے، مگر جیسے جیسے وہ زیادہ باتیں سنتا اور مشاہدہ کرتا ہے، اس کے اندر ایک بغاوت جنم لیتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں سفید فام طاقتوں نے ہر جگہ اپنی حاکمیت قائم کر رکھی ہے، چاہے وہ جنوبی افریقہ ہو، آسٹریلیا، امریکہ، یا فلسطین ہو۔

بچوں کو مذہب، سیاست اور سماجی نظام کے متعلق جو باتیں سکھائی جاتی ہیں، وہ اکثر تضادات سے بھری ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر، بچہ سوچتا ہے کہ اگر قبر میں انسان بند کر دیا جاتا ہے تو فرشتے اندر کیسے آتے ہیں؟ یہ سوال معصوم لگ سکتا ہے، لیکن اس میں ایک گہرا نفسیاتی پہلو پوشیدہ ہے—بچہ اپنی منطق اور عقلی سوچ کے ذریعے مذہبی تعلیمات کا تجزیہ کر رہا ہے۔ اسی طرح، بچہ "حکومت" کے بارے میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے یہ ایک غیر مرئی قوت محسوس ہوتی ہے جو صرف بڑوں کے معاملات میں دخل دیتی ہے۔ یہ طاقت کے مجرد تصور کے حوالے سے بچوں کی ابتدائی نفسیاتی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے۔

کہانی کا اہم نکتہ "زمین" کے تصور کے گرد گھومتا ہے۔ بچہ، جو ابتدائی طور پر جاسوسی ناولوں، کہانیوں اور مذہبی سوالات میں دلچسپی رکھتا ہے، اچانک زمین کی ملکیت پر سوال اٹھانے لگتا ہے۔ افسانے کے اختتام پر، اس کا سوال "ایک سفید آدمی کو کتنی زمین چاہیے ہوتی ہے؟" دراصل استعماری ذہنیت کے لالچ اور تسلط کے خلاف ایک معصوم مگر گہرا اعتراض ہے۔ نفسیاتی طور پر، یہ سوال بچے کی اپنی شناخت اور آس پاس کی دنیا میں اپنے مقام کے بارے میں شعوری ارتقاء کی علامت ہے۔

نفسیاتی نظریات کو دیکھیں تو یہ افسانہ فرانز فینن (Frantz Fanon) کے نوآبادیاتی نفسیات کے نظریے سے جڑا ہوا ہے۔ فینن نے کہا تھا کہ نوآبادیاتی نظام کے تحت بسنے والے لوگ ایک مسلسل شناختی بحران کا شکار رہتے ہیں، کیونکہ وہ ایک ایسی دنیا میں جیتے ہیں جو انہیں کمتر ثابت کرتی ہے۔ یہاں بھی بچہ ایک سوال کے ذریعے اس نظام کی منافقت کو چیلنج کر رہا ہے۔

حسن منظر کا یہ افسانہ نفسیاتی سطح پر ایک ایسے بچے کی ذہنی نشوونما کو دکھاتا ہے جو تعصب، ناانصافی، اور طاقت کے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پہلے اقتباس میں اس کی نفرت اس کے خاندان کے اندر موجود نسلی تعصب کی وجہ سے ابھرتی ہے، جبکہ دوسرے اقتباس میں وہ نوآبادیاتی نظام پر ایک بنیادی سوال اٹھا کر اپنی شعوری ترقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ کہانی اس بات کی عمدہ مثال ہے کہ کس طرح ایک سماجی اور سیاسی نظام بچوں کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے، اور وہ اپنے معصومانہ سوالات کے ذریعے بڑی حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر افسانہ "سفید آدمی کی دنیا" صرف سامراجی نظام پر تنقید نہیں بلکہ یہ اس کے نفسیاتی اثرات کا بھی گہرا مشاہدہ پیش کرتا ہے۔ یہاں دکھایا گیا ہے کہ بچوں کے ذہن کس طرح بڑی سماجی اور سیاسی حقیقتوں سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے اندر تضادات پیدا ہوتے ہیں۔ کہانی کے ذریعے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ طاقت، نسل پرستی، اور استعماری رویے صرف سیاسی مسائل نہیں بلکہ انسانی نفسیات کا بھی حصہ بن جاتے ہیں۔ بچے کے سوالات ایک ایسے معاشرے کی پیداوار ہیں جو تضادات سے بھرا ہوا ہے، اور اس کی معصوم منطق ان تضادات کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے ذہن کی نشوونما کو دکھاتی ہے جو معصومیت سے حقیقت کی تلخیوں کی طرف بڑھ رہا ہے، اور جو بڑی عمر کے افراد کے برعکس، بغیر کسی تعصب کے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

نفسیاتی پہلوؤں لیے ہوئے حسن منظر کا افسانہ "میری موت" میں ایک منفرد اور غیر روایتی موت کے تجربے کو بیان کیا گیا ہے، جس میں راوی اپنی موت کے بعد کے مناظر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کہانی میں ایک خاص طرح کی بے حسی، حقیقت پسندی اور طنزیہ رویہ نمایاں ہے جو قاری کو موت کی رسم و رواج اور سماجی روایات پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

یہ کہانی ایک مرنے والے شخص کے ذہنی رویے اور خیالات کا آئینہ ہے، جو زندگی اور موت کو ایک فلمی منظر کے طور پر دیکھتا ہے۔ وہ اپنی موت کو کسی غیر معمولی یا جذباتی واقعہ کے بجائے ایک معمولی اور پہلے سے دیکھے ہوئے سین کے طور پر بیان کرتا ہے۔ اس کی یہ سوچ دراصل اس کے وجودی رویے (existential perspective) کی عکاسی کرتی ہے، جس میں وہ زندگی اور موت کو ایک تسلسل کے طور پر دیکھتا ہے، نہ کہ کوئی جذباتی یا المیہ واقعہ۔

راوی کا اندازِ بیان ایک الگ قسم کی ذہنی حالت کو ظاہر کرتا ہے، جس میں وہ موت کے خوف سے آزاد ہو چکا ہے لیکن جنت اور موت کے بعد کی زندگی کے تصور سے ایک غیر مرئی اضطراب محسوس کرتا ہے۔ اس کا کہنا کہ "یہ جنت والا تصور میرے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ تم جانتی ہو میں چپچپاتی ہوئی ہر چیز سے بدکتا ہوں" اس طرح اس کا اندرونی خوف اور بے چینی واضح ہوتی ہے۔ اور موت کے بعد کی غیر یقینی کیفیات کے بارے میں اس کے مخلوط جذبات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ راوی کے ذہن میں موت کا کوئی ڈر نہیں، بلکہ وہ اسے ایک عام اور بار بار ہونے والا عمل سمجھتا ہے۔ وہ اپنی زندگی سے بھی بے زار لگتا ہے اور کسی جذباتی وابستگی کے بغیر اپنی زندگی کا اختتام دیکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> ''تم خدا کے گھر کو غیر کی جاگیر سمجھتی ہو اس لیے موت کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ رکھتی ہو، میں اس زندگی سے پہلے کے گھر کو بھول چکا ہوں۔''(۱۰)

یہ جملہ اس کے غیر روایتی خیالات اور موت کے بارے میں اس کے فلسفیانہ نظریے کو ظاہر کرتا ہے۔ دراصل کہانی میں راوی ان رسومات کا طنزیہ مشاہدہ کرتا ہے جو مرنے والے کے ساتھ انجام دی جاتی ہیں، جیسے کلمہ پڑھوانا، زمزم پلانا، اور بکرے کو قربان کرنا۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ سب ایک طے شدہ رسم کا حصہ ہیں، جن کا مقصد صرف مرنے والے کو ایک مذہبی طور پر "محفوظ" مقام پر پہنچانا ہے۔

> "مجھے اسی صبح ہسپتال سے گھر لایا گیا تھا کیونکہ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے اور حکیم و ہومیو پیتھ وغیرہ بھانپ چکے تھے کہ میرے کیس کو لینا گھاٹے کا سودا ہے۔" (۱۱)

یہ جملہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ معاشرتی طور پر لوگ کس طرح کسی کے قریب المرگ ہونے پر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے مذہبی و رسمی اقدامات میں لگ جاتے ہیں۔ افسانے میں سب سے نمایاں نفسیاتی عنصر "ڈی ریئلائزیشن" اور "ڈی پرسنلائزیشن" ہے، جہاں مرنے والا اپنی موت کو ایک خارجی تجربے کے طور پر دیکھتا ہے۔ وہ خود کو اپنی تدفین کے مراحل کو دیکھتے ہوئے پاتا ہے، لیکن جذباتی سطح پر مکمل طور پر لاتعلق نظر آتا ہے۔ دراصل ڈی ریئلائزیشن (Derealization) میں انسان کو ارد گرد کا ماحول غیر حقیقی، خواب جیسا یا دھندلا محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ حقیقت سے کٹا ہوا ہو۔ اشیاء اور لوگ مانوس ہونے کے باوجود اجنبی لگ سکتے ہیں۔ ڈی پرسنلائزیشن (Depersonalization) میں انسان خود کو اپنے جسم یا خیالات سے علیحدہ محسوس کرتا ہے، جیسے وہ خود کو باہر سے دیکھ رہا ہو یا اس کی شناخت دھندلا رہی ہو۔ یہ دونوں کیفیتیں عام طور پر ذہنی دباؤ، اضطراب (Anxiety) یا تھکن کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور عموماً عارضی ہوتی ہیں۔

مصنف نے افسانہ میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرنے والے کے لیے موت کتنی گہری حقیقت ہوتی ہے، لیکن باقی دنیا کے لیے یہ بس ایک رسمی کارروائی ہے۔ جنازے میں شریک لوگ شروع میں غمگیں نظر آتے ہیں، مگر جلد ہی گفتگو عام موضوعات کی طرف مڑ جاتی ہے۔ راوی کا بیٹا خاموشی سے روتا ہے، لیکن اس کا رونا بھی آواز سے خالی ہے۔ یہ رویہ اس بات کا اظہار ہے کہ غم ہر شخص کے لیے مختلف ہوتا ہے۔ کچھ لوگ چیخ کر روتے ہیں، جبکہ کچھ خاموشی سے اپنی تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ بیٹے کا رویہ اس گہرے غم کی علامت ہے جو بیان سے باہر ہے۔ افسانہ تدفین کے رسوم و رواج پر ایک گہرا طنز بھی پیش کرتا ہے۔ لوگ رسمی طور پر کلمہ پڑھتے ہیں، مگر زیادہ دیر تک ایسا نہیں کر پاتے۔ کچھ لوگ قبروں پر بیٹھ کر کانٹے نکالنے لگتے ہیں، جبکہ کچھ آخری رسومات سے پہلے ہی تھکن کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ رویہ "مذہبی رسومات کی نفسیاتی مجبوری" کی طرف اشارہ کرتا ہے، جہاں لوگ رسم و رواج کو محض ایک ذمہ داری سمجھ کر ادا کرتے ہیں، بغیر کسی حقیقی جذباتی وابستگی کے۔ مرنے والے کا کفن مٹی سے آلودہ ہو رہا ہے، اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ وہ اب مکمل طور پر دنیا سے کٹ چکا ہے۔ وہ قبر میں لیٹ کر سوچتا ہے کہ کیسے وقت کی ستم ظریفی لوگوں کو بدل دیتی ہے۔

یہ افسانہ محض موت کا بیان نہیں، بلکہ اس کے بعد ہونے والی بے حسی، رسم و رواج کی سطحیت اور غم کے مختلف اظہار کی ایک نفسیاتی دستاویز بھی ہے۔ راوی ایک بے حس، حقیقت پسند اور طنزیہ شخصیت کا حامل ہے جو اپنی موت کے منظر کو جذباتی ہونے کے بجائے ایک فلم کی طرح دیکھتا ہے۔ اس کا فلسفہ زندگی کو ایک معمولی تسلسل کے طور پر دیکھنے کا ہے، جہاں کسی بھی چیز کو زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہیے۔ افسانہ قارئین کو ایک نفسیاتی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے جہاں وہ خود کو بھی راوی کی جگہ رکھ کر سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مرنے کے بعد ان کے ساتھ کیا ہوگا؟ یہ کہانی ہمیں نہ صرف موت کی حقیقت کا سامنا کراتی ہے بلکہ زندگی کی بے ثباتی اور انسانی رویوں کی سچائیوں کو بھی ہمارے سامنے عیاں کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی موت کی کہانی ہے جو زندگی کی حقیقت کو مزید واضح کر دیتی ہے۔

حسن منظر کے افسانے "لاسہ" کو نفسیاتی تناظر میں سمجھنے کے لیے، ہمیں اس کے مرکزی کرداروں کی ذہنی کیفیات، لاشعوری جذبات، اور ان کے نفسیاتی تضادات پر غور کرنا ہوگا۔ کہانی میں انسانی نفسیات میں چھپی ہوئی پیچیدگیوں، خوف اور غیر یقینی کیفیات کو بڑی مہارت

سے پیش کیا گیا ہے۔ افسانے میں بنیادی نفسیاتی عنصر عدم تحفظ اور خوف ہے، جو کرداروں کی نفسیاتی عوامل کو نمایاں کرتا ہے۔ "لاسہ" میں موجود کردار زندگی کی غیر متوقع مشکلات اور ان کے اثرات سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ ان کا لاشعور مسلسل ایک نادیدہ خطرے کی گرفت میں رہتا ہے، جو انھیں حقیقی زندگی سے مزید دور لے جاتا ہے۔

حسن منظر کے کچھ افسانوں میں کردار خود کلامی کرتے ہیں، اپنے ماضی کے واقعات پر غور کرتے ہیں اور اپنی ذہنی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں یادداشت اور ماضی کی بازگشت ایک مستقل عنصر کے طور پر موجود رہتی ہے، جہاں کردار اپنی پرانی یادوں میں قید ہو کر حال سے کٹ جاتے ہیں۔ وہ حقیقت اور تخیل کے درمیان جھولتے ہیں، جس سے بعض اوقات قاری کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے کہ کہانی کا کون سا حصہ حقیقی ہے اور کون سا محض ذہنی وہم ہے۔ اسی طرح حسن منظر افسانے "لاسہ" میں ایسے کردار موجود ہیں۔ جن کی ماضی کی یادیں کرداروں کی ذہنی حالت پر گہرے اثرات ڈالتی ہیں۔ کرداروں کا ماضی ان کے شعور پر ایک نفسیاتی بوجھ بن کر سوار رہتا ہے، جس کی وجہ سے وہ حال میں بھی قید محسوس کرتے ہیں۔ یہ ماضی ایک ایسی زنجیر بن جاتا ہے جو نہ تو مکمل طور پر ٹوٹتی ہے اور نہ ہی مکمل طور پر جکڑتی ہے، بلکہ کرداروں کی نفسیاتی کشمکش کو مزید شدید بنا دیتی ہے۔ مصنف اس کیفیت کو علامتی انداز میں بیان کرتے ہیں، جہاں کرداروں کی نفسیات کسی بھی واضح سمت کا تعین نہیں کر پاتی۔

مصنف نے افسانہ کے ذریعے انسانی شعور اور تحت الشعور کے درمیان کشمکش کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ کرداروں کے ظاہر اور باطن میں واضح تضاد پایا جاتا ہے، جو ان کے اندرونی خلفشار اور ذہنی عدم استحکام کو نمایاں کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "ہم سب زندگی کی اس گتھی کو سلجھانے میں لگے ہیں، جو شاید کبھی نہ سلجھے۔ نہ جانے ہم کیا ڈھونڈ رہے ہیں، اور نہ جانے جو کچھ ہم نے کھو دیا ہے، وہ ہمیں کبھی واپس ملے گا یا نہیں۔" (۱۲)

یہ اقتباس کرداروں کی نفسیاتی الجھن اور عدم استحکام کو ظاہر کرتا ہے، جہاں وہ ماضی، حال، اور مستقبل کے درمیان کہیں الجھے ہوئے ہیں۔ افسانہ "لاسہ" ایک نفسیاتی مطالعہ کے طور پر ہمیں انسانی شعور کی نازک حالتوں، یادداشت کے اثرات، اور شناخت کے بحران کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ حسن منظر نے بڑی مہارت سے انسانی نفسیات کی کشمکش کو الفاظ میں ڈھالا ہے، جو قاری کو ایک گہرے فکری تجربے میں مبتلا کر دیتا ہے۔

اسی طرح حسن منظر کے افسانے "ساتھ" میں بھی انسانی نفسیات کے پیچیدہ پہلوؤں کو بڑی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی ایک بوڑھے سسر اور اس کی بیوہ بہو رابعہ کے درمیان تعلق پر مبنی ہے، جس میں جذباتی، نفسیاتی اور معاشرتی کشمکش کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانے میں بوڑھا سسر ایک ایسے شخص کے طور پر دکھایا گیا ہے، جو اپنی عمر کے آخری حصے میں شدید احساسِ تنہائی اور عدم تحفظ کا شکار ہے۔ اس کا ذہن ماضی کے تجربات، حال کے خدشات اور مستقبل کے خوف کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ بوڑھا سسر اپنی زندگی میں سب کچھ گنوا بیٹھا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی زندگی اب اختتام کے قریب ہے، لیکن اس کے باوجود اس کا ذہن مستقل مزاجی سے موت کے بعد کے حالات کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ خاص طور پر وہ اپنی بہو کے مستقبل کے بارے میں پریشان رہتا ہے کہ "میرے مرنے کے بعد وہ بھائیں بھائیں کرتے گھر میں کیا کرے گی؟" یہ خیال اس کے اندر موجود ذمہ داری کے احساس اور انسانی فطرت میں موجود کنٹرول کی خواہش کو ظاہر کرتا ہے۔ بوڑھا جب رابعہ کے ساتھ رہتا ہے تو وہ اس کے لیے ہمدردی اور تحفظ کے جذبات محسوس کرتا ہے، لیکن یہ جذبات بتدریج ایک نئی قسم کی قربت کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں۔ اس کے لاشعور میں رابعہ کے ساتھ ایک جذباتی اور جسمانی رشتہ قائم کرنے کی خواہش پنپنے لگتی ہے۔ یہاں ادھیڑ عمری کے مسائل اور مرد کی نفسیاتی کشمکش پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔

افسانے میں خوابوں کے ذریعے نفسیاتی اہمیت بھی واضح کی گئی ہے۔ وہ بوڑھا سسر خواب میں دیکھتا ہے کہ رابعہ اکیلی ہے، دروازہ بند کر رہی ہے اور گھر خالی ہو چکا ہے۔ یہ خواب اس کے اندرونی خوف اور نفسیاتی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے، جو اس کے لاشعور میں رابعہ کی تنہائی کو ختم کرنے کی خواہش کی علامت بھی ہو سکتا ہے یہ خواب خود فریبی کی بھی نشاندہی کرتا ہے، جس میں وہ اپنے جذبات کو کسی اور زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ رابعہ کی شخصیت احساسِ محرومی اور معاشرتی جبر کے گرد گھومتی ہے۔ رابعہ کی ماں اس کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی اور باپ کے بارے میں بھی زیادہ علم نہیں تھا۔ اس کے بہن بھائی بھی نہیں تھے۔ اس کا ماضی ایک احساسِ محرومی اور جذباتی خلا سے بھرا ہوا ہے، جس کی وجہ سے وہ زندگی کے خوبصورت خواب نہیں دیکھ سکتی۔ رابعہ کی شادی گویا ایک گھر سے بندھی زنجیر تھی۔ وہ شوہر کے ساتھ کہیں جانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ گھر کو چھوڑنے کا تصور ہی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ سماجی دباؤ اور عورت کی نفسیاتی الجھن کو ظاہر کرتا ہے، جہاں عورت کو قربانی اور ایثار کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ رابعہ کو اپنی ساس کے غیر ضروری علاج، عملیات اور توہمات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اپنے شوہر کی موت کے بعد مکمل طور پر سسر کے سائے تلے زندگی گزار رہی ہے۔ سسر کے ساتھ اس کا تعلق ابتدا میں بیٹی اور والد جیسا تھا، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اس میں غیر محسوس طریقے سے ایک اور طرح کی قربت پیدا ہونے لگی۔ یہ خوف، محتاجی، اور جذباتی وابستگی کا امتزاج تھا۔

بعض اوقات بوڑھا خود کو کمزور محسوس کرتا ہے، لیکن وہ اپنی جوان بہو کے ذریعے طاقت، تسکین اور قربت تلاش کرنا چاہتا ہے۔ وہ رابعہ کو قائل کرنے کے لیے مختلف طریقے آزماتا ہے، جیسے کہ ہمدردی اور دل لگی وغیرہ۔ اس کے علاوہ خوابوں اور کہانیوں کے ذریعے اس کی ذہن سازی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس بوڑھے سسر کے ذہن میں یہ خیال مسلسل گونجتا ہے کہ وہ رابعہ کے بغیر اکیلا رہ جائے گا، اور اس خیال سے بچنے کے لیے وہ رابعہ کو بھی اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ رابعہ معاشرتی روایات اور اندرونی جذبات کے درمیان پھنسی ہوئی ہے۔ اس کے خواب بھی اتنے بے رنگ ہیں کہ اس کے پاس جذباتی آسودگی کے لیے کچھ نہیں۔ لیکن جب سسر خواب بیان کرتا ہے کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے، تو وہ اسے خوفزدہ کرنے والا خواب سمجھتی ہے۔ رابعہ اس کے جذبات کو سمجھ کر بھی نظرانداز کرتی ہے، شاید اس پر ترس کھاتے ہوئے یا خود کو مزید الجھن سے بچانے کے لیے اس کو اپنے قرب میں جگہ دے دیتی ہے۔ اس صورتحال کو مصنف نے افسانے میں یوں بیان کیا ہے:

> "جب وہ جاگی تو سسر کرسی پر اس کے سر کے پیچھے جہاں کو سر ڈھلک گیا تھا اپنا چھوٹا سا تکیہ یا لگانے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ پسینے پسینے ہو رہی تھی۔
>
> انھوں نے کہا" سوتی رہو۔"
>
> رابعہ کو جیسے سکون مل گیا ہو اور اس کی رات بھر کی جگی ہوئی آنکھیں دوبارہ بند ہو گئیں۔"(۱۳)

مجموعی بات کی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ افسانہ "ساتھ" میں مردانہ نفسیات کی کمزوری اور عورت کی خاموش جدوجہد کو عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بوڑھا اپنے لاشعور میں رابعہ کے ساتھ قربت چاہتا ہے، لیکن وہ خود کو یہ تسلی دینے میں لگا رہتا ہے کہ یہ محض فکرمندی ہے۔ رابعہ کے پاس کوئی اور راستہ نہیں، لیکن وہ خاموش مزاحمت کے ذریعے خود کو اس نفسیاتی جال سے نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔ آخر میں بوڑھا خود کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتا ہے کہ اس کا ان باتوں کو سوچنا بے کار ہے، اور یوں وہ ایک جھوٹی تسلی میں جینے لگتا ہے۔ یہ کہانی معاشرتی، نفسیاتی اور جذباتی سطح پر مرد اور عورت کے درمیان طاقت کے توازن اور تنہائی کی الجھنوں کو نمایاں کرتی ہے، جو اسے ایک نفسیاتی شاہکار بناتی ہے۔۔

حسن منظر کا افسانہ "برسی" گہرے نفسیاتی المیے اور یادداشت کے دھندلکوں میں لپٹے جذبات کی ایک دلگیر داستان ہے۔ اس کہانی میں غم کی نوعیت، یادداشت کی شکست وریخت، اور انسانی ذہن کی دفاعی حکمتِ عملیوں کو نہایت حسّاسیت سے بیان کیا گیا ہے۔ جنگ سیر اور اجت کے درمیان مکالمہ محض دو کرداروں کی گفتگو نہیں، بلکہ یہ دکھ کے دو مختلف اظہار ہیں۔ ایک خارجی دنیا کے ساتھ مفاہمت کرنے کی کوشش میں اور دوسرا داخلی کرب کی گہرائی میں ڈوبے ہوئے۔ جنگ سیر کا بظاہر بھولا پن، حقیقت میں اس کے اندرونی دفاعی میکانزم کا حصہ ہے، جو اسے شدید صدمے سے محفوظ رکھنے کے لیے متحرک ہوتا ہے۔ افسانے میں وقت اور یادداشت کی الجھنیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ انسان بعض تکلیف دہ لمحات کو بھلانے میں غیر ارادی طور پر کامیاب ہو جاتا ہے، مگر دوسروں کا دکھ اسے آئینہ دکھا دیتا ہے۔ اجت کا الزام، کہ جنگ سیر اپنے بچے کی برسی بھی بھول گیا، دراصل اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ خود بھی شاید اس یاد کو مستقل طور پر ذہن میں تازہ نہ رکھ سکی۔ یہ نفسیاتی کشمکش اس وقت واضح ہوتی ہے جب جنگ سیر ایک لمحے کے لیے اپنی یادداشت کی کمزوری کو تسلیم کرنے کے بجائے اسے خارجی دنیا کی غلطی قرار دیتا ہے: مرقوم ہے:

> "میں پوچھتی ہوں ان کے پانچ سال پہلے مرے ہوئے لڑکے کے غم میں تو تم سوچ سوچ کے حیران ہوتے رہے کہ خواجہ معین الدین کے چاند میں مرنے والے کی برسی رجب میں کیسے پڑ گئی اور اپنے لڑکے کی پہلی برسی بھی تمھیں کل دن بھر یاد نہیں آئی!"(۱۴)

یہاں اجت کا غصہ اور دکھ دراصل اس کے اندرونی ٹوٹ پھوٹ کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ اس غم سے نمٹنے کے لیے یادوں کو ٹھوس شکل دینے کی کوشش کرتی ہے، مگر جنگ سیر اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ دن عام دنوں کی طرح گزر جائے، کیونکہ اگر وہ یاد کرے گا تو وہ صدمہ دوبارہ پوری شدت کے ساتھ اس پر حملہ آور ہو جائے گا۔ اس کا یہی انکار، اور اجت کا یہی تقابل، اس کہانی کو ایک نفسیاتی المیے میں تبدیل کر دیتا ہے، جہاں محبت، غم، اور یادداشت کی کشمکش مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ حسن منظر کا ایک اور افسانہ "اوپر والی" ایک پیچیدہ نفسیاتی اور سماجی حقیقت کو پیش کرتا ہے، جہاں دو کردار یاسمین اور رفیک کھان اپنی اپنی نفسیاتی الجھنوں، محرومیوں، اور وقتی تسکین کے لیے ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔

افسانے میں رفیک کھان کا کردار ایک ایسے مرد کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی زندگی کی یکسانیت اور جذباتی خلا کو پُر کرنے کے لیے ایسے تعلقات میں پناہ لیتا ہے جو وقتی تسکین فراہم کرتے ہیں لیکن مستقل نہیں ہوتے۔ وہ یاسمین کے پاس محض جسمانی خواہشات کی تسکین کے لیے نہیں آتا بلکہ اس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی اور زندگی میں کسی حقیقی تعلق کی کمی نظر آتی ہے۔ رفیک کھان کی نفسیاتی کیفیت اس کی گفتگو اور رویے سے واضح ہوتی ہے۔ وہ اپنی موجودگی کو غیر رسمی اور عارضی بنا کر پیش کرتا ہے، جیسے وہ خود بھی اس لمحے کے جذبات کو مکمل طور پر قبول نہیں کر رہا۔ اقتباس دیکھیے:

> "یہ مرگا تو پکا اور تیرے ہاتھ کا پکا ہوا میں بھی کھاؤں اور تو بھی میرے سنگ کھا۔"(۱۵)

یہ جملہ اس کے اندرونی تضاد کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ یاسمین سے وقتی تعلق رکھتا ہے لیکن اسے کسی حد تک ایک روایتی، سماجی تعلق میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ "تیرے ہاتھ کا" کھانے کی خواہش کا اظہار ایک گہرے تعلق خواہش کی علامت ہو سکتی ہے، جو اس کے اپنے رشتے میں نہیں ملتی۔

رفیک کھان کا کردار محض جسمانی تعلق کی خواہش تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک خاص قسم کی وابستگی اور جذباتی تسکین بھی چاہتا ہے۔ اس کا یاسمین کے لیے رویہ محض تجارتی نہیں، بلکہ ایک خاص حد تک اپنائیت لیے ہوئے رہا۔ رفیک کھان یاسمین کے ساتھ ایک وقت گزارنے والے تعلق سے کچھ زیادہ چاہتا ہے، یا کم از کم وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اس تعلق میں وقتی تسکین سے زیادہ بھی کچھ ہے۔ تاہم، یاسمین کی طرف سے ملنے والے طنزیہ جملے اور اس کے سوالات (جیسے مرغے کو پہلے کہاں لے کر گئے تھے) ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اس کی نیت اور نفسیاتی حالت کو مکمل طور پر سمجھ چکی ہے۔ رفیک کھان کی شخصیت میں ایک تضاد بھی نمایاں ہے۔ وہ یاسمین کے ساتھ وقت گزارنے کے باوجود ایک قسم کے افسوس کا بھی شکار ہوتا ہے۔ مرقوم ہے:

> "پھر ہمت کر کے اس نے رفیک کھان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ رفیک کھان نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا اور اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں نہ کام اندھ تھی نہ کوئی لوبھ تھا بلکہ جو تھوڑا بہت افسوس شروع میں ہوا بھی تھا کہ میں ایکا ایکی جمعے والے دن کہاں سے کہاں پہنچ گیا، وہ بھی غائب ہو گیا۔"(۱۶)

یہ اقتباس بھی ظاہر کرتا ہے کہ رفیک کھان ایک دوہری زندگی گزار رہا ہے۔ ایک طرف وہ اپنے گھریلو اور سماجی کردار میں جڑا ہوا ہے، جہاں وہ "وکیل کو نپٹانے" اور "بڑے بھائی کے ناراض ہونے" کی فکر کرتا ہے، اور دوسری طرف وہ اپنی خواہشات کے آگے بے بس ہے۔ یہ احساسِ جرم یا ندامت کا عنصر اس کی نفسیاتی پیچیدگی کو نمایاں کرتا ہے۔ افسانے میں یاسمین اور رفیک کھان کا تعلق خالصتاً جذباتی یا محبت پر مبنی نہیں بلکہ ایک خاص طرح کے سماجی نفسیاتی عوامل سے جڑا ہوا ہے۔ یاسمین، جو اس تعلق کی نوعیت کو اچھی طرح جانتی ہے، ایک طرح سے اس کی حقیقت کو قبول کر چکی ہے۔ اس کا طنزیہ انداز اور آخری جملہ "سب اوپر والی کے ہاتھ میں ہے۔"

یہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس تعلق کو محض قسمت کا کھیل سمجھتی ہے اور اسے زیادہ سنجیدہ نہیں لیتی۔ وہ جانتی ہے کہ رفیک کھان کے ساتھ اس کا رشتہ ایک خاص حد تک محدود ہے اور وہ اس تعلق سے زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرتی۔ دراصل رفیک کھان کا کردار ایک ایسے مرد کا عکاس ہے جو اپنی سماجی ذمہ داریوں اور جذباتی خواہشات کے درمیان پس رہا ہے۔ وہ وقتی تسکین کی تلاش میں ہے لیکن کہیں نہ کہیں وہ ایک گہرے تعلق کی خواہش بھی رکھتا ہے۔ تاہم، وہ اس خواہش کو قبول کرنے یا اس کے لیے کوئی حقیقی قدم اٹھانے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اس کا کردار ایک پیچیدہ نفسیاتی حقیقت کو پیش کرتا ہے، جہاں مرد اپنی جذباتی اور جسمانی خواہشات کے درمیان توازن قائم کرنے میں ناکام رہتے ہیں، اور بالآخر خود کو جذباتی طور پر خالی محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ سیڑھیاں اترتا ہے تو "بڑا دکھی سا محسوس کرتا ہے" کیونکہ اس کا تعلق نہ تو مکمل طور پر تسکین بخش ہے اور نہ ہی دیرپا۔ وہ ایک ایسے تعلق میں پھنسا ہوا ہے جس کا کوئی مستقبل نہیں، اور یہی اس کے اندرونی خلا اور نفسیاتی الجھن کا ثبوت ہے۔

حسن منظر کے افسانے زندگی کے خارجی مناظر کو محض عکس بند نہیں کرتے، بلکہ انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو ایکسرے کی طرح پرکھتے ہیں۔ وہ دیکھنے اور دکھانے کے فن میں مہارت رکھتے ہیں، لیکن ان کی بصارت محض ظاہری دنیا تک محدود نہیں، بلکہ ان کی بصیرت انسانی ذہن کی گہرائیوں میں اتر کر پوشیدہ کیفیات اور لاشعوری محرکات کو بھی آشکار کرتی ہے۔ حسن منظر اپنے افسانوں میں پیچیدہ اور سنگین موضوعات کو نفسیاتی گہرائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ انسانی ذہن کی الجھنوں اور داخلی کشمکش کو فلسفیانہ انداز میں بیان کرتے ہیں اور بعض اوقات فینٹسی کا سہارا لے کر لاشعوری کیفیات کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ:

"حسن منظر افسانہ کے نحیف پیکر میں بڑے سنگین، کثیر الجہت اور آج کے چبھتے ہوئے موضوعات سمونے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ بھی پورے معاشرتی تناظر میں۔ یہی نہیں وہ ان موضوعات کا احاطہ نفسیاتی اور فلسفیانہ دونوں سطحوں پر ایک ساتھ کرتے ہیں، اس کے لیے وہ کبھی فینٹسی کا سہارا بھی لیتے ہیں۔"(۱۷)

حسن منظر کے اکثر افسانے فرد کی داخلی کشمکش، یادداشت کی شکست وریخت، اور صدمے کے اثرات کو نفسیاتی تجزیے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ ان نازک لمحوں کو گرفت میں لاتے ہیں جب انسان اپنے ہی ذہن کے دھندلکوں میں الجھ جاتا ہے، حقیقت اور واہمے کی سرحدیں مدھم ہونے لگتی ہیں، اور لاشعوری خوف، احساسِ جرم، نیا ندامت اس کے فیصلوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ حسن منظر کے کردار اکثر کسی نہ کسی صدمے یا محرومی کے اثرات میں گھرے ہوتے ہیں، اور ان کے نفسیاتی ردِ عمل ہی کہانی کی روح بنتے ہیں۔

ان کی کہانیاں ایک ایسے سیلانی ذہن کی کاوش ہیں جو انسانی وجود کی گہرائی میں جھانکنے کی جستجو رکھتا ہے۔ وہ انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں جو عموماً نظر سے اوجھل رہتے ہیں خوف، بے یقینی، لاشعوری مزاحمت، اور وہ دکھ جو وقت کے ساتھ شعور کی سطح پر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے بیداری کے وہ خواب ہیں جو فرد کی نفسیاتی گتھیوں کو کھولتے ہیں اور ہمیں اس کے اندرونی اضطراب سے روشناس کراتے ہیں۔

حسن منظر کا اسلوب ان کے افسانوں میں نفسیاتی گہرائی کو مزید مؤثر بنا دیتا ہے۔ وہ سادہ مگر بامعنی جملے استعمال کرتے ہیں اور کرداروں کے ذہنی خیالات کو براہ راست پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں "داخلی خود کلامی (Interior Monologue) "اور "فلیش بیک" کی تکنیک عام ہے، جو کرداروں کے ماضی اور حال کے بیچ تعلق کو واضح کرتی ہے۔

حسن منظر کے افسانوں میں کردار اکثر اپنی ذاتی خواہشات اور سماجی توقعات کے درمیان الجھے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شناخت اور آزادی کے لیے کوشاں ہوتے ہیں مگر روایات اور سماجی دباؤ انہیں محدود کر دیتا ہے۔ کئی افسانے ایسے موضوعات پر مبنی ہیں جہاں کردار صحیح اور غلط کے درمیان کشمکش کا شکار ہیں۔ یہ اخلاقی الجھنیں ان کے ذہنی انتشار کو ظاہر کرتی ہیں۔ حسن منظر کے افسانے انسانی ذہن کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کامیاب کوشش ہیں۔ وہ نہ صرف کرداروں کی داخلی کشمکش کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ قاری کو بھی ان کی نفسیاتی الجھن کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ ان کے افسانے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ انسانی نفسیات ایک پیچیدہ اور نازک معاملہ ہے، جو مختلف حالات میں مختلف رخ اختیار کر سکتی ہے۔ اس طرح حسن منظر کے افسانے اردو ادب میں نفسیاتی حقیقت نگاری کے بہترین نمونے سمجھے جا سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مہر ونہ لغاری۔ حسن منظر: ادبی خدمات۔ ملتان: شعبہ اردو، بہاالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۱۴ء۔ ص ۴۴

۲۔ حسن منظر۔ ایک اور آدمی، مشمولہ: ایک اور آدمی، کراچی: فضلی سنز، اردو بازار، ۱۹۹۹ء۔ ص ۲۴

۳۔ حسن منظر۔ بیچارے، مشمولہ: ندیدی، حیدر آباد: آگہی پبلیشرز، جولائی ۱۹۸۲ ء۔ ص ۲۲

۴۔ حسن منظر۔ للی، مشمولہ: ندیدی۔ ص ۱۴۷

۵۔ ایضاً۔ ص ۱۶۸

۶۔ حسن منظر۔ ہمارے دن، ہمارا زمانہ، مشمولہ: ندیدی۔ ص ۲۱۳

۷۔ حسن منظر۔ ہمارے دن، ہمارا زمانہ، مشمولہ: ندیدی۔ ص ۲۴۲

۸۔ حسن منظر۔ سفید آدمی کی دنیا، مشمولہ: رہائی، حیدر آباد: آگہی پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء۔ ص ۸۱

۹۔ ایضاً۔ ص ۱۰۱

۱۰۔ حسن منظر۔ میری موت، مشمولہ: رہائی۔ ص ۲۱۴

۱۱۔ ایضاً۔ ص ۲۱۶

۱۲۔ حسن منظر۔ لاسہ، مشمولہ: ایک اور آدمی۔ ص ۱۳۳

۱۳۔ حسن منظر۔ ساتھ، مشمولہ: انسان کا دیش، جہلم: بک کارنر، ۲۰۲۳ء۔ ص ۵۶

۱۴۔ حسن منظر۔ برسی، مشمولہ: انسان کا دیش۔ ص ۴۰

۱۵۔ ایضاً۔ ص ۶۵

۱۶۔ حسن منظر۔ اوپر والی مشمولہ: انسان کا دیش۔ ص ۶۵

۱۷۔ قمر رئیس، ڈاکٹر۔ مشمولہ: انسان کا دیش۔ ص ۵